ڈاکٹر عابد سیال
فارن ایکسپرٹ (اردو)، فیکلٹی آف ایشین لینگوئجز اینڈ کلچرز،
گوانگ تانگ یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز، گوانگ زو، چین

مجید امجد کی غزل: سیاسی زاویہ

Majeed Amjad is one of the prominent poets of modern era of Urdu poetry. He is known to be a trend setter poet of Nazm, however, his ghazal is equally important with regard to its thematic approach as well as stylistic characteristics. His poetry very expressively manifests his political vision in every genre of poetry he composed. However, his way of expression is different and a bit indirect as compared to his contemporary poets. He expressed sorrows, miseries and problems of the common people caused due to political exploitation and social injustice. This article is an attempt to analyze Majeed Amjad' sghazal in this context.

مجید امجد کی شاعری کا زمانہ، ان کی دستیاب مدوّن اور مرتب شاعری کی روشنی میں، ۱۹۳۲ء سے شروع ہوتا ہے جب وہ کالج میں ایف اے کے طالب علم تھے۔ اتفاق ہے کہ یہی ''انگارے'' کی اشاعت کا سال ہے جو ادبی محاذ پر سیاسی جبر اور سماجی گھٹن کے خلاف کئی عشروں سے پنپتے شعور کے پھٹ پڑنے کی مثال ہے۔ یوں مجید امجد کی شاعری کا آغاز ایک ایسے زمانے سے ہوتا ہے جو برصغیر میں عملی سیاست کے تموّج اور عوامی سطح پر سیاسی شعور کی پختگی کا زمانہ ہے۔ نمایاں سیاسی حوالہ اس زمانے کے ادب کے عمومی خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجید امجد کے ابتدائی دور کی نظمیں بھی ان کے گہرے سیاسی شعور کا اظہار ہیں جو ''یہی دنیا'' جیسی نظموں میں دھیمے سروں اور ''نفیرِ عمل'' جیسی نظموں میں نعرے کی حد تک پہنچتی ہوئی بلند آہنگی کے ساتھ موجود ہے۔

اس تناظر میں اگر مجید امجد کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو صورت حال مختلف نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا کی مرتبہ ''کلیات مجید امجد'' کے دوسو سے زائد صفحات پلٹنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں کہی گئی ایک غزل میں یہ شعر آتا ہے جس سے کھینچ تان کر کوئی سیاسی معنی نکالا جاسکتا ہے:

چکیدِ اشکِ فراواں سے ہے کشید شراب
جہانِ قیصروجم میں تہی پیالہ پھرو

(۱۹۵۰ء)(۱)

اس سے اگلے سال کی ایک غزل کا یہ مطلع بھی اس مطالعے میں شامل کیا جا سکتا ہے جو ایک طرف ان کے ایک مرغوب موضوع تقدیر کے جبر کا ایک زاویہ سامنے لاتا ہے اور دوسری طرف سماجی مرتبے کے تفاوت کو روحانی مساوات کی دلیل

سے قطع کرنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔

ترے فرقِ ناز پہ تاج ہے، مِرے دوشِ غم پہ گلیم ہے
تِری داستاں بھی عظیم ہے ، مِری داستاں بھی عظیم ہے

(۱۹۵۱ء)(۲)

بعد کے تین چار سال کی غزلوں میں مجید امجد کے ہاں زیادہ وضاحت کے ساتھ رزم گاہِ جہاں میں شعور و ادراک کے ساتھ زندہ رہنے کی سعی کا اظہار ہوتا ہے۔لیکن یہ اشعار اسلوب کی ندرت کے باوجود سیاسی شعور کے حوالے سے عمومی مضامین کے حامل ہیں۔بیدار حسیت کے ساتھ زندہ رہنے کی آرزو، زمانے سے ٹکرا جانے کے عزم کا اظہار جس میں نالہ و فریاد کے ناشنیدہ رہنے کا قلق بھی شامل ہو جاتا ہے۔

تم اک جزیرۂ دل میں سمٹ کے بیٹھ رہے
مِری نگاہ میں طوفانِ صد زمانہ رہا

نہ شاخِ گل پہ نشیمن نہ رازِ گل کی خبر
وہ کیا رہا جو جہاں میں قلندرانہ رہا

(۱۹۵۲ء)(۳)

اور

انھی کی زندگی جو چل پڑے ہیں
تِری موجوں سے ٹکرانے ، زمانے

(۱۹۵۳ء)(۴)

نہیں سنتا کوئی مجھ کشتۂ آلام کے شکوے
کیے میں نے ہر اک ایواں کی چوکھٹ تھام کے شکوے

(۱۹۵۶ء)(۵)

۱۹۵۷ء میں مجید امجد کی ایک ایسی غزل سامنے آتی ہے جس میں ان کے سیاسی شعور کی تمام جہتیں وضاحت کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں۔ نئے دور کی بشارتوں کا راز، نظامِ سیاست، تصورِ وطن، جرأت و جسارت، اور موجود و آئندہ کے بارے میں انھوں نے نہایت واضح انداز میں اپنے افکار کا اظہار کیا ہے۔غزل کے حوالے سے مجید امجد کے سیاسی شعور کی دریافت کے لیے اس غزل سے بہتر کوئی اور تخلیق ان کے سرمائے میں شاید ہی ملے۔

وہ شے جو ایک نئے دور کی بشارت ہے
ترے لہو کی تڑپتی ہوئی حرارت ہے
نظامِ کہنہ کہ سائے میں عافیت سے نہ بیٹھ
نظامِ کہنہ تو گرتی ہوئی عمارت ہے
وطن چمکتے ہوئے کنکروں کا نام نہیں
یہ تیرے جسم تری روح سے عبارت ہے
یہ کہہ رہی ہے صدا ٹوٹتے سلاسل کی
کہ زندگی تو فقط اک حسین جسارت ہے
یہ اک جھلک ہے بدلتے ہوئے زمانوں کی
جبیں جبیں پہ شکن بھی کوئی بجھارت ہے
چمن میں اہلِ چمن کے یہ طور، ارے توبہ
کلی کلی کی ہنسی خندۂ حقارت ہے
دلوں کی جھونپڑیوں میں بھی روشنی اترے
جو یوں نہیں تو یہ سب سیلِ نور اکارت ہے

(۱۹۵۷ء)(۶)

اس غزل میں غزل مسلسل کا رنگ موجود ہے اور اس کے اشعار مل کر ایک ایسا منظر نامہ مرتب کرتے ہیں جو اس دور کی سیاسی ہلچل کی تصویر بھی ہے اور جس میں اس کے مضمرات کی جھلک بھی ہے۔ کم مستعمل قافیوں کے نئے پن کے احساس کے ساتھ ساتھ اس غزل میں ایک داخلی ہلچل کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ ایک دبا دبا جوش اور فیصلہ کن انداز اس عہد کی سیاسی فضا میں موجود تناؤ اور بیداری کی لہر کی خبر دیتا ہے۔ اس غزل کے ایک شعر میں تصورِ وطن کے حوالے سے ایک نہایت اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ اقبال نے مغرب کے تصورِ وطن، جس کی بنیاد جغرافیے پر تھی، کے برعکس اسلامی وطنیت کا تصور پیش کیا جس کا تعلق روحانی اور ذہنی علاقے سے ہے۔ ع اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے۔ اس تصور کی تشریح اکثریت نے کچھ ایسے انداز سے کی جس سے اس وطنیت کا روحانی دائرہ براعظموں کو عبور کرتا ہوا امت مسلمہ کی عالمگیر وحدت میں تو ڈھل گیا لیکن ارضی وابستگی کے اس لازمی عنصر کو معدوم ہی کر دیا گیا جس کا انقطاع نہ اسلام کا تقاضا تھا اور نہ اقبال کا منشا۔ نتیجہ ثقافتی اور تہذیبی وابستگی کے سوال پر پیدا ہونے والے شناخت کے اس بحران کی صورت میں نکلا، قیامِ پاکستان کے بعد کے تین عشرے جس کا حل تلاش کرنے کی جستجو میں گزر گئے تا آنکہ سقوطِ ڈھاکا کے سانحے نے سوال

کرنے کی ہمت بھی چھین لی۔ شناخت کے اسی حوالے سے مجید امجد نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ وطن ترے جسم اور تری روح سے عبارت ہے۔ یہ تصورِ وطن کی ایک ایسی فطری صورت ہے جس میں فکری توازن بحال کرنے کا سامان موجود ہے۔ اسی طرح ٹوٹتے سلاسل کی صدا، جسارت، بدلتے زمانوں کی جھلک ایک منظر ہے تو جبینوں پر شکنیں اور خندۂ حقارت دوسرا منظر جو خلقِ مقہور کے بدلے ہوئے تیور دکھاتے ہیں۔ اور آخر پہ یہ بیان کہ اگر دلوں کی جھونپڑیاں روشن نہیں ہوتیں تو سیلِ نور اکارت ہے، اپنی جگہ فیصلہ بھی ہے اور انتباہ بھی۔ یوں یہ پوری غزل نہایت بلیغ انداز میں اپنے عہد کا داخلی اور خارجی سیاسی منظر دکھاتی ہے۔

اک تم کہ مرگِ دل کے مسائل میں جی گئے
اک ہم کہ ہیں بہ کشمکشِ جان و تن پڑے

(۱۹۵۹ء)(۷)

ان شعروں کے تقریباً بارہ سال بعد دو ایسی غزلوں کا پڑاؤ آتا ہے جن میں خارجی سیاسی واقعات کے فوری اور بلاواسطہ بیان کی صورت نظر آتی ہے۔ یہ غزلیں ۱۹۷۱ء کی ہیں اور جنگ کے مناظر اور کیفیات کی تصویر کشی ان میں موجود ہے۔ پہلی غزل یہ ہے:

جنگ بھی تیرا دھیان بھی ، ہم بھی
سائرن بھی ، اذان بھی،ہم بھی
سب تری ہی اماں میں شب بیدار
مورچے بھی، مکان بھی، ہم بھی
تیری منشاؤں کے محاذ پہ ہیں
چھاؤنی کے جوان بھی، ہم بھی
دیکھنے والے یہ نظارا بھی دیکھ
عزم بھی، امتحان بھی، ہم بھی
اک عجب اعتماد سینوں میں
فتح کا یہ نشان بھی، ہم بھی
تو بھی اور تیری نصرتوں کے ساتھ
شہر میں ٹکّا خان بھی، ہم بھی

(۱۹۷۱ء)(۸)

اس غزل کی داخلی ساخت اور ہیئت کا اچھوتا پن اور اس کی لفظیات کی ندرت پر بات کرنے کے لیے تو الگ مضمون درکار ہے؛ اس کے موضوعات و کیفیات بھی ایسی ہیں جو اردو غزل کی روایت میں کم یاب ہیں۔ خارجی مظہر اور داخلی کیفیت کی باہم آمیزی مجید امجد کا خاصہ ہے۔ بقول ڈاکٹر اسلم انصاری:

> ان کا تخلیقی شعور خارجی حقائق کے ادراک اور داخلی واردات کے متشکل ہونے کا ایک انوکھا نقطۂ اتصال تھا۔ اگرچہ ہر سچّے شاعر کا تخلیقی شعور کم و بیش یہی وظیفہ سرانجام دیتا ہے لیکن مجید امجد کے یہاں تخلیق تجربہ کئی راستوں سے ہوتا ہوا اور کئی جہتوں کی نقش گری کرتا ہوا ایک ایسا معنوی پیرایہ اختیار کرتا ہے جو اپنے ہی جیسے ایک بے حد انوکھے اور منفرد لفظی اسلوب کے ساتھ پیوست ہوتا ہے۔ (۹)

جنگ، سائرن اور اذان کی یکجائی سے رزمیہ کیفیت ابھارنا اور اس میں جذبے کی استقامت اور بیان کی لطافت کے پہلو بیک وقت برقرار رکھنا مضمون کی تلاش اور اسلوب کی تراش کا ایسا نمونہ ہے جس کی مثال اردو غزل کی روایت میں شاذ ہی ملے گی۔ اسی طرح مورچوں، مکانوں اور مکینوں کی شب بیداری اور منشاؤں کے محاذ کی بات بھی اردو غزل کے کان میں پہلی دفعہ ہی پڑی ہے۔ اور پھر آخری شعر۔ اس شعر پر مجھے اکثر غالب کا وہ مصرع یاد آتا ہے کہ ع بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے۔ اس مصرعے میں اس نام کی برجستگی دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ نام رکھا ہی اسی لیے گیا تھا کہ غالب اسے اس مصرعے میں چست کر سکے۔ اسی طرح مجید امجد نے ٹکا خان کے نام کو اس کے سیاسی حوالے کے ساتھ ساتھ ایک جمالیاتی زاویہ عطا کر کے اس کی عمر بڑھا دی ہے۔

ایک اور غزل جس کے خطابیہ ردیف کی وجہ سے اس کا عنوان ''اے قوم'' رکھ کے اسے نظموں کے کھاتے میں ڈالا گیا ہے، وہ بھی اسی طرح کی لفظیات سے سجی ہوئی ہے۔

پھولوں میں سانس لے کہ برستے بموں میں جی
اب اپنی زندگی کے مقدس غموں میں جی
وہ مائیں، جن کے لال لہو میں نہا گئے
صدیوں اب ان کے آنسوؤں، اکھڑے دموں میں جی
جب تک نہ تیری فتح کی فجریں طلوع ہوں
باردو سے بھری ہوئی ان شبنموں میں جی
ان آبناؤں سے ابھر، ان ساحلوں پہ لڑ
ان جنگلوں میں جاگ اور ان دمدموں میں جی
پیڑوں سے مورچے میں جو تجھ کو سنائی دیں
آزاد ہم صفیروں کے ان زمزموں میں جی

بندوق کو بیانِ غمِ دل کا اذن دے
اک آگ بن کے پوربوں اور پچھموں میں جی

(۱۹۷۱ء)(۱۰)

اس غزل میں بھی مجید امجد نے اپنی اسی تجربے کو بڑھاوا دیا ہے کہ خارجی سیاسی واقعات کی کھردراہٹ کو لطافت میں، ان کے ہنگامی ہیجان کو دیرپا ٹھہراؤ میں، ان سے متعلق اکہری سپاٹ اور بے حس تمثالوں کو جیتے جاگتے استعاروں میں کیسے بدلنا ہے۔ یہ دراصل موضوع کو مضمون میں بدلنے کی بات ہے۔ مجید امجد نے سیاسی موضوعات کو خالص غزل کے مضامین کا درجہ دے کر اس کی دماغ جھنجھوڑنے والی شدت کو حواس میں سرایت کرتی ہوئی آگہی بنا دیا ہے۔ بلراج کومل لکھتے ہیں:

> مجید امجد جس معاشرے میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے، جوان ہوئے اور حدودِ حیات و مرگ کے پار چلے گئے، غلاظتوں اور ناہمواریوں کا معاشرہ تھا۔ اس میں اندرونی اور خارجی جبر واستبداد بھی تھا اور استحصال بھی۔ اس لیے مجید امجد کے کلام کی ایک واضح سطح ایک ایسے حساس انسان کے ردِعمل کی سطح ہے جو زندگی کے مظاہر کی ارضی تفصیلاتِ روز وشب بغور دیکھتا ہے لیکن ان خراشوں اور زخموں کو دیکھ کر اداس ہو جاتا ہے جن سے ان کے معاشرے کے زیادہ تر چہرے ملوث ہیں۔(۱۱)

اس کے بعد کی غزلوں کے جن اشعار میں سیاسی حوالہ موجود ہے وہ اس سے بھی زیادہ لطیف اور گہرا ہے۔ یہ چونکہ ان کی آخری عمر کی شاعری ہے اس لیے اس کے لہجے میں انکشاف اور تیقن کے عناصر نمایاں ہیں۔لطافت و گہرائی اور انکشاف و تیقن کے یہ عناصر باہم آمیز ہو کر مجید امجد کے ہاں ایک ایسے فقیرانہ رویے کا روپ دھار لیتے ہیں جس میں زندگی کو کسی نہ کسی طور نباہنے کا نقطہ نظر موجود ہے۔صورت حال سے غیر مطمئن رہنا اور زندگی کرتے چلے جانا دونوں رویے ان کے ہاں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ حمید نسیم لکھتے ہیں کہ ''مجھے کلیات کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوا کہ مجید امجد فطری طور پر فقیر منش ہیں۔ صورتحال کے خلاف ہونا ان کے لیے ایک فطری تقاضا ہے۔صرف ایک فیشن ایبل تحریک سے وابستگی کا اظہار نہیں۔''(۱۲)

اس ڈھب سے جئیں، سینوں کے شرر، جھونکوں میں گھلیں، قدروں میں تلیں
کاوش ہے کوئی مشکل تو یہی، کوشش ہے کوئی ممکن تو یہی

(۱۹۷۲ء)(۱۳)

سوادِ نور سے دیکھیں تو تب سراغ ملے
کہ کس مقام کی ظلمت ہے کس جہاں کے لیے
ترس رہے ہیں سدا خشت خشت لمحوں کے دیس
جو میرے دل میں ہے اس شہرِ بے مکاں کے لیے

(۱۹۷۳ء)(۱۴)

مل کر سب تعمیر کریں، اک ارماں
اک یہ ملک، اور رزق، اور گیت، اور خوشیاں
جیتی مٹی! تیرے نام کی ٹھنڈک
میرے اک اک گرم آنسو میں پنہاں
گلی کوئی بے نام، مکاں بے نمبر
ہے آباد مرا گھر، کنعاں کنعاں

(۱۹۷۳ء)(۱۵)

وفات سے ایک سال پہلے کی ایک معروف غزل کے یہ چند اشعار بھی نمایاں سیاسی زاویہ رکھتے ہیں۔

جب ایک سانس گھسے، ساتھ ایک نوٹ پِسے
نظامِ زر کی حسیں آسیا، جو تو چاہے
بس اک تری ہی شکم سیر روح ہے آزاد
ب اے اسیرِ کمندِ ہوا، جو تو چاہے
جو تیرے باغ میں مزدوریاں کریں امجد
کھلیں وہ پھول بھی اک مرتبہ، جو تو چاہے

(۱۹۷۳ء)(۱۶)

سیاسی اور معاشی نظاموں کی جکڑ میں آئے ہوئے پیروجواں ان اشعار کے کردار ہیں۔شکم سیر روح کی ترکیب پورے انسان کی بات کرتی ہے جو جسم اور روح کا مرکب ہے، جن کے الگ الگ تقاضے ہیں۔ انسان شکم پروری کرتا ہے تاکہ اس کا تقاضا پورا ہوتو وہ آگے بڑھ کر روح کے مسائل کی طرف متوجہ ہو، لیکن اس سے اگلا دام حرص و ہوا کا ہے۔ لہٰذا اس کشمکش میں انسان کا ارادہ ہی اس کا مقام ہے یعنی اب اے اسیرِ کمندِ ہوا جو تو چاہے۔

اس پورے تناظر میں دیکھا جائے تو مجید امجد کی غزل سیاسی شعور کا ایک ایسا نمونہ پیش کرتی ہے جو ادراک کے حوالے سے گہرا اور مکمل ہے اور اظہار کے حوالے سے لطیف و منفرد۔ مجید امجد اپنے گردوپیش پر نظر کرتا اور نظر رکھتا ہوا چوکس حواس کا شاعر ہے۔ درویشی و استغنا اور کم آمیزی کی زندگی گزارنے والا یہ تخلیقی آدمی جب اپنی شاعری میں منکشف ہوتا ہے تو ہنگامۂ دنیا کے عین بیچ میں کھڑا نظر آتا ہے۔

خود اپنے غیب میں بن باس بھی ملا مجھ کو
میں اس جہان کے ہر سانحے میں حاضر بھی

(۱۹۷۳ء)(۱۷)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ مجید امجد، کلیات مجید امجد، مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ص ۲۰۹

۲۔ ایضاً، ص ۲۱۸

۳۔ ایضاً، ص ۲۳۳

۴۔ ایضاً، ص ۲۴۰

۵۔ ایضاً، ص ۲۸۱

۶۔ ایضاً، ص ۲۹۱

۷۔ ایضاً، ص ۳۳۱

۸۔ ایضاً، ص ۶۱۴

۹۔ اسلم انصاری، دیباچہ مجید امجد: بیاضِ آرزو بکف از سید عامر سہیل، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱

۱۰۔ مجید امجد، کلیات مجید امجد، ص ۶۱۵

۱۱۔ بلراج کومل، ''مجید امجد ایک مطالعہ'' مشمولہ گلاب کے پھول، مرتبہ: محمد حیات خاں سیال، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۴

۱۲۔ حمید نسیم، کچھ اور اہم شاعر، فضلی سنز، کراچی، س ن، ص ۹۰

۱۳۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد، ص ۶۶۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۰۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۷۱۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۷۱۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۷۱۹